اردو تنقید کی محترم آواز: آل احمد سرور

ڈاکٹر صفدر

بی،کوہ نور کالونی، پوسٹ وی ایم وی، امراوتی، موبائل:07304755117

آل احمد سرور اردو تنقید کی ایک برگزیدہ شخصیت ہیں۔ سرور صاحب ترقی پسندی سے الرجک رہے نہ اس طوفان میں خس وخاشاک کی طرح بہے۔ ساٹھ کے بعد جدیدیت کا رجحان تیزی سے بڑھنے لگا۔ ترقی پسند ناقدین نے اس رجحان کو روکنے کی کوشش کی۔ سرور صاحب نے لکھنے والوں سے بھی کشادگیٔ قلب ونظر کے ساتھ ملے۔ جس طرح انھوں نے ترقی پسندوں کی انسان دوستی کو قبول کیا اور ادعائیت سے دامن بچایا تھا اسی طرح جدیدیت پسندوں کے کارناموں کو سراہا، مگر نکسلائٹ بننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ ان کی وسعت نظر، کشادگیٔ قلب ونظر اور اپنی نظر سے وفاداری کا رشتہ استوار رکھنے کا نتیجہ ہے کہ وہ مختلف اور متضاد بلکہ متصادم رجحانات کے علمبردار حلقوں میں محبوب اور محترم رہے ہیں۔ اس فکری وعملی توازن کے پس پردہ یہ بات نہیں ہے کہ وہ تھوڑی دور ہر راہ رو کے ساتھ چلنے لگتے ہیں بلکہ یہ ایک سوچا سمجھا اور ذاتی غور وفکر کے بعد اختیار کیا گیا راستہ ہے۔ 'مسرت سے بصیرت تک' کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں:

> ''ادب میری محبت ہے.....کہا جاتا ہے کہ کسی آدمی یا ادارے یا قوم کو پہچاننے کے لیے پہلے اس سے محبت ضروری ہے.....یہی محبت عرفان کی منزل تک لے جائے گی اور محبوب کی خوبیوں اور خامیوں دونوں سے آگاہ کرے گی۔''

بیسویں صدی میں چوتھائی صدی گزرنے کے بعد ہمارے یہاں نظریات کی گھٹائیں گھر آئیں اور ادعائیت کے جھکڑ چلے۔ اس طوفان خیز ماحول میں جو چیز ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے وہ یہی 'محبت' ہے۔ سرور صاحب کو لاگ اور لگاؤ کی جگہ 'عرفان' سے رشتہ استوار کرتا دیکھ کر بے پایاں مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ آج اردو میں تنقید کی ایک بنیادی صفت 'معروضیت' کا بہت چرچا ہے۔ معروضیت کا دعویدار یوں تو ہر شخص ہے، مگر اس کا اختیار کردہ راستہ اس کی سمت بدل دیتا ہے۔ 'محبت سے عرفان' کی سمت جو راستہ جاتا ہے وہی معروضیت کا راستہ ہے۔ یہ راستہ اردو شعر وادب میں بہت کم لوگوں نے ڈھونڈ نکالا ہے۔

اس محبت کے راستے سے عرفان کی جس منزل کی طرف نقاد سرور صاحب پہنچتے ہیں اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔ 'مسرت سے بصیرت تک' ہی میں رقم طراز ہیں:

> ''اردو شاعری پر میر کے جو احسانات ہیں ان کا احساس عام ہے مگر ان کا عرفان کم ملتا ہے۔''

میں نے سرور صاحب کی تنقید نگاری کو سمجھنے کے لیے تمام نوٹس 'مسرت سے بصیرت تک' سے لیے ہیں۔ معاملہ دراصل یہ ہے کہ اس کے بعد ان دیگر تصانیف پڑھنے کے بعد مزید نوٹس لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اب آیئے ذیل میں ان کے تنقیدی نظریات کا جائزہ لیں۔

سرور صاحب کے نزدیک شعری تنقید سے کیا مراد ہے یہ سمجھنے کے لیے میں ذیل میں دو اقتباسات نقل کرتا ہوں۔

۱۔ اپنے مضمون 'نئی اردو شاعری' میں لکھتے ہیں:

> ''اس مقالے میں نئی اردو شاعری کا ایک مختصر جائزہ تین عنوانات کے تحت لیا جائے گا۔ نئی شاعری کیوں؟ نئی شاعری کیا؟ نئی شاعری کیسے؟ اور سچی بات یہ ہے کہ تنقید خواہ نئی شاعری کی ہو یا پرانی شاعری کی انہی تین سوالوں کے جواب کی کوشش ہوتی ہے۔''

۲۔ ایک اور مقالے 'میر کے مطالعے کی اہمیت' میں لکھا ہے:

> ''میر کے متعلق کچھ کہنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ میر کی عظمت کا تجزیہ یا اس کا سائنٹفک مطالعہ ابھی تک پورے طور پر نہیں ہوسکا ہے۔ کسی شاعر پر تنقید کے لیے سب سے اہم اس کا کلام ہے، لیکن اس کے لیے شاعر کے حالات زندگی، اس کی شخصیت کے نمایاں پہلو، اس کے ماحول، اس سے پہلے کی شاعری کے اسالیب، سب کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن کا یہ خیال غلط نہیں ہے کہ زمانہ کسی شاعر کو یوں ہی اہم قرار نہیں دیتا، مگر اسے آنکھ بند کرکے تسلیم کرنے سے فکر کی راہیں بند ہوجاتی ہیں اور تنقید میں ایک تقلیدی رنگ آجاتا ہے جو ادب کی ترقی کے لیے مضر ہے۔''

ان اقتباسات کی روشنی میں ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرسکتے ہیں:

۱۔ نقاد کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ زیر مطالعہ فن پارے کے محرکات کیا ہیں؟
۲۔ اس فن پارے کے مضمرات کیا ہیں؟
۳۔ اس فن پارے کی قدر و قیمت کیا ہے؟

ان باتوں کا جواب پانے کے لیے ان کا طریق کار یہ ہے کہ:

۱۔ مسلمات پر ایمان بالغیب نقاد کا شیوہ نہیں بلکہ اس کے لیے فن پارے کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔
۲۔ اس تجزیے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نقاد شاعر کے حالات زندگی اور اس کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں سے واقف ہو۔
۳۔ نہ صرف زیر مطالعہ شاعر کا کلام بلکہ ماقبل کی شاعری کے اسالیب سے بھی اس کو واقفیت ہو۔
۴۔ ایمان بالغیب سے تنقید، تقلید کا شکار ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً ادب منفی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ شاعری کیا ہے؟

سرور صاحب کے نزدیک شاعری نہ وقت گزاری کا مشغلہ ہے، نہ تفریح کا ذریعہ۔ وہ شاعری کو ذہنی عیاشی سمجھتے ہیں نہ سیاسی، سماجی، معاشی نظریات کی تبلیغ نہ فلسفہ کی باندی نہ مذہب کی چار دیواری میں مقید خانہ زاد۔ ادب کے یہ غیر ادبی معیارات اردو تنقید میں جا بجا کھڑے ہوئے ہیں۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ نظریات آج بھی اردو تنقید میں جمے رہنے کے درپے ہیں۔ سرور صاحب نے کلاسیک کا مطالعہ بھی ان اصولوں کی روشنی میں کیا ہے جو جدید شعر و ادب کے لیے بھی صحیح میزان بن سکتے ہیں۔ ذیل میں چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں جن کی روشنی میں سرور صاحب کے تصور شعر کو سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۔ اپنے ایک مضمون 'فیض ایک باشعور اور صاحب طرز شاعر' میں رقم طراز ہیں:

''میں شاعری کی بصیرت کو مانتا ہوں، مگر فراسٹ کی طرح اس شاعری کا قائل ہوں جو پہلے مسرت اور پھر بصیرت عطا کرے۔ محض بصیرت کی دعوت میں کشش نہیں ہوتی۔ ہاں مسرت کی تلاش عام ہے۔ جو مسرت کو بصیرت بھی عطا کر دے وہی سچا شاعر ہے۔''

۲۔ اسی کتاب میں اپنے مضمون 'میر کے مطالعے کی اہمیت' میں لکھتے ہیں:

''میر اس لیے بڑے شاعر نہیں ہیں کہ وہ ماحول کے مصور ہیں۔ وہ اس لیے بڑے شاعر ہیں کہ ان کے اشعار اس بھرپور احساس سے لبریز ہیں جو زندگی کی گہری بصیرت سے حاصل ہوتا ہے۔ جو حالات اور واقعات کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ ان کے پیچھے جو ذہنی دنیا ہے اس کا دروازہ ہمارے لیے کھول دیتا ہے۔''

۳۔ اسی کتاب کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

''اگر شاعری کی مخصوص بصیرت کو تسلیم کر لیا جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ نہ کسی اور علم سے کمتر ہے نہ برتر، مگر اس کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی اور باطنی حقیقت تبدیل بھی ہوگی اور اس تبدیلی کے باوجود انسان کی روح کے بعض تاروں کو ہمیشہ چھیڑتی رہیں گی تو نہ شاعری کو سیاست کے کسی پیرائے میں دیکھا جائے گا نہ سماج کے کسی مخصوص آئینے میں نہ فلسفے کے کسی نظام میں، نہ مذہب کے کسی مخصوص اور امر و نواہی کے سلسلے میں اور پھر یہ بھی ہوگا کہ بڑی شاعری کے لیے یہ شرطیں نہ لگائی جائیں گی کہ وہ مذہب سے کیوں غذا حاصل کرتی ہے، مارکس سے کیوں نہیں یا مارکس کا نام کیوں لیتی ہے مذہب کا کیوں نہیں لیتی۔ شاعر سے ہمارا مطالبہ صرف یہ ہوگا کہ وہ اپنی نظر سے وفادار ہو۔''

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں:

۱۔ شاعری مسرت اور بصیرت کے امتزاج کا نام ہے۔
۲۔ شاعری ماحول کی تصویر کشی یا صحافتی رپورٹنگ کا نام نہیں ہے۔
۳۔ شاعرانہ بصیرت، سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور فلسفیانہ نظریات کی بازگشت نہیں ہے بلکہ تجربات حیات سے، احساس کے وسیلے سے حاصل شدہ ادراک کا نام ہے۔

یہ نظریات مذہبی ہو یا سماجی علوم سے متعلق ہوں شاعری کی شناخت میں ہماری کوئی مدد نہیں کرتے۔

سرور صاحب بڑی شاعری اور معمولی شاعری کا پیمانہ بھی وضع کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک معمولی شاعر یا دوسرے درجے کا شاعر شعر و ادب کے معین آفاق میں چہل قدمی کرتا ہے جبکہ بڑا شاعر اس گھیرے کو توڑ کر نئے آفاق دریافت کرتا ہے گویا فکری بلند پروازی بڑی شاعری کی موجب ہوتی ہے۔ ذیل میں چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ مضمون 'میر کے مطالعے کی اہمیت' میں فرماتے ہیں:

''اول و دوم درجے کے شاعروں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اول درجے کا شاعر کچھ کلیدی الفاظ رکھتا ہے جس کی وجہ سے اس کی شاعری میں ایک جدت، تازگی اور طرفگی کا احساس ہوتا ہے۔ دوسرے درجے کے شاعر روایتی کلیدی الفاظ کو کامیابی سے برت لینا کافی سمجھتے ہیں۔''

۲۔ اسی مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

''فن کی بہار، فکر کی حنابندی کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ میر کا فن اس لیے برگزیدہ اور بلند پایہ ہے کہ ان کے آئینۂ فکر میں پرخلوص جذبات کا جوہر ہے اور یہ تجربات ذاتی ہوتے ہوئے بھی ایک عمومی رنگ رکھتے ہیں۔''

۳۔ مضمون 'غالب اور جدید ذہن' میں تحریر فرماتے ہیں:

''ایک فن پارہ اسی نسبت سے آفاقی ہوتا ہے جس نسبت سے اس میں خصوصی تجربہ ہوتا ہے، مگر یہ تجربہ فیشن یا فارمولے یا گروہ کے خیالات کی پاسداری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے اپنے دل گداختہ سے پگھل کر نکلتا ہے اس لیے بنیادی شرط فنکار کے خلوص اور اس کی نظر اور اس نظر کے قطرے میں دجلہ کے امکانات دیکھنے کی صلاحیت کی ہے۔ فنکار سے محض شدید جذبات یا مانگے ہوئے اجالے سے چراغاں کرنے کی توقع غلط ہے۔ اس سے اخلاقی پیام یا امید کی کرن مانگنا بھی بے سود ہوگا۔ یہاں محض الفاظ کی خوبصورتی کا بھی سوال نہیں ہے جو خیال کے ہمراہ ہوتی ہے اور اسے خوشگوار بناتی ہے۔ یہاں اصلی سوال فنکار کی بصیرت اور اس بصیرت کی گہرائی کا ہے اور اس کے حسیات کے دائرے کا۔ اسی کو پاؤنڈ interpretative power یعنی اس کی زندگی کی ترجمانی کی صلاحیت کہتا ہے۔ ہمیں شاعر سے یہ مطالعہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ ہمیں تسلی دے یا نجات اور اگر شاعر تسلی یا نجات کی خاطر اپنے خصوص تجربے کو توڑتا مروڑتا ہے تو اپنے اور فن دونوں کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔''

ان اقتباسات کی روشنی میں ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں:

۱۔ بڑے شاعر کے یہاں حسیات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔

۲۔ بڑی شاعری فکری بلند پروازی کے بغیر ممکن نہیں۔

۳۔ مانگے تانگے کے خیالات اور افکار کے بجائے بڑے شاعر کے یہاں ادراک ذاتی تجربوں کا حاصل ہوتا ہے۔

۴۔ بڑے فنکار کی اچھوتی فکر نئی لفظیات میں ظہور پذیر ہوتی ہے یعنی بڑی شاعری نئی لفظیات بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔

سرور صاحب نے نظم اور غزل کے فرق، شاعری اور الفاظ کا تفاعل وغیرہ موضوعات کو بھی اپنی عملی تنقید میں چھیڑنے کی کوشش کی ہے، مگر سچ یہ ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ جس طرح ان کے بعد آنے والی نسل کے ناقدین میں وزیر آغا نے علم الانسان کی روشنی میں اور شمس الرحمٰن فاروقی نے ہیئتی تنقید کے طریق استدلال سے نظم اور غزل کے فرق کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، سرور صاحب کے یہاں ایک واضح فرق کو گرفت کرنے اور نتیجہ اخذ کرنے میں کامیابی نہیں ملتی۔ شاعری اور الفاظ کے مابین تعلق پر بھی سرور صاحب کی گفتگو عمومیت زدہ ہے اور شبلی اور وزیر آغا کی طرح پردے اٹھانے کا عمل نہیں بن پاتی۔

میں نے سرور صاحب پر گفتگو کا آغاز معروضیت سے کیا تھا۔ یہ معروضیت سرور صاحب کے یہاں بڑی حد تک موجود ہے، مگر کہیں کہیں ان کی تنقید عمومیت زدہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ سرور صاحب نے حسرت کے بارے میں لکھا ہے کہ ''انھوں نے شہرتیں عطا کیں اور تاج اتارے۔'' نقاد کو بھی یہی کام کرنا ہوتا ہے، مگر افسوس کہ سرور صاحب تاج اتارنے کے کام سے ڈرتے رہے۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ وہ آنکھ بند کر کے مسلمات پر ایمان لے آنا بھی نقاد کے منصب کے منافی سمجھتے ہیں، مگر اکثر واقعات وہ اس کے برعکس کام کرتے ہیں مثلاً جگر کا محاکمہ کرتے ہوئے وہ جگر کے تاج کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجتاً ان کی تنقید عمومیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ جگر کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے بہتیرے سوالات اٹھائے ہیں، مگر ایک کا بھی جواب نہیں دے پاتے۔ ایک اقتباس ان کے مضمون 'جگر مرادآبادی' سے ملاحظہ فرمائیے:

> ''جگر کے یہاں تغزل اور سرمستی کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں لیکن تغزل اور سرمستی تو دوسرے کے یہاں بھی ہے۔ آخر جگر کی انفرادیت کیا ہے؟ جگر کی اپنی آواز کون سی ہے؟ وہ تھرتھراہٹ، وہ لئے کیا ہے؟ جسے ہم ہزاروں آہٹوں اور کروٹوں میں پہچان لیں۔ جگر نے عشق کی انانیت اور خودداری پر بار بار زور دیا ہے..... مگر یہ جگر کا کارنامہ نہیں ہے..... جگر نے اردو غزل کی ساری صالح روایات کو جذب کر کے انہیں ایک لطیف تبسم اور دلکش رمز بنا دیا ہے..... اس کی معنویت، رمزیت اور تاثیر میر، مومن، داغ، حسرت سے آشنا ہوئے بغیر واضح نہیں ہوتی، مگر ان روایات کے ساتھ اور ان کے باوجود ایک نئی صحت مند، شگفتہ اور پرکیف اشاریت رکھتی ہے جو اس کی اپنی ہے۔''

اشاریت، رمزیت، پرکیف تبسم، پرکیف اشاریت! کیا یہ تنقیدی محاکمہ ہے؟ یہ وہی غیر تنقیدی باتیں ہیں جنھیں وزیر آغا جراحی کے صدیوں پرانے آلات سے تعبیر کرتے ہیں۔

بہرحال آل احمد سرور ترقی پسند تنقید اور جدید تنقید کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس پل کو عبور کیے بغیر اردو تنقید کا کارواں آگے نہیں بڑھ سکتا تھا لہٰذا سرور صاحب کی تنقید کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ○○